خلافت تحریک

دوسری قسط

ڈاکٹر اخلاق احمد

علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کا آغاز پہلی جنگ آزادی کی سنگ میل ہے خاتمے کی ضامن پہلی جنگ عظیم ہے جس کی وجہ سے شبلی کی مزاجی کیفیت بھی اثر انداز ہوئی۔ ان دو عظیم گھماؤ کے درمیان ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی ایک گردش میں رہی۔ شبلی اپنی عقیدت مندی، تیز فہمی سیمابی طبیعت، قومی جذبے اور مزاج کی تیزی کی وجہ سے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک طرف وہ سرسید کو پیشوا تسلیم کرتے تھے لیکن دوسری جانب دین و سنت کا نظریہ دونوں کا الگ الگ تھا۔ شبلی نہ تو پوشیدہ رہے نہ کسی کو پوشیدہ رہنے دیا۔ وہ خاردار زندگی گزارتے رہے بدن سے لہو رسنے کی پروا نہیں کی۔ ان کے بیباک خیالات اور جذبات سے برطانوی سامراجیت کسی نور اور روشنی سے دوچار ہوتی رہی تھی۔ شبلی کی شاعرانہ بصیرت اور گہرائی، جوش اور ولولے نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو خواب غفلت کے ما[illegible] تھے ان کے شعور پہ چابکے مار مار کر بیدار کر دیا اور ان کے مذہبی افکار صداقت کی شکل میں سامنے آئے۔ شبلی خلافت تحریک کے لب بام سے پانچ سال پیچھے رہ گئے کیونکہ عمر نے وفا نہ کی۔ [illegible] بلقان کے دوران جو نظمیں لکھیں وہ حال کے علاوہ مستقبل کی ارواح میں سمائیں۔ یہی [illegible] نظمیں خلافت تحریک کی تحریک گرمی کے لیے کافی ثابت ہوئیں ۱۹۱۱ء میں طرابلس اور ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگیں ہوئیں۔ شبلی کے دل پر چوٹ پڑی ان کے احساسات کے تاروں کی جھنکار اٹھی اور تھرا گئے کیونکہ ان کو ترکوں سے عشق تھا اور کوئے یار کی خاک بھی چھان آئے تھے ان خیالات کا تاثر ہمیں شبلی کی نظموں سے ترجمانی ہوتا ہے

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کبتک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کبتک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک

زوالِ دولتِ عثمانِ زوالِ شرعِ ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کبتک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کبتک

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستان تک ہے

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیری ملت
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے

پڑا سوتا ہے کوئی گنبد خضرائے یثرب میں
کہ جس کا بندہ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے

ایک دن تھا کہ وفاداری مسلم کی متاع
ہر جگہ عام تھی اور نرخ میں ارزانی تھی

دفعۃً ہو گئی ہنگامۂ بلقان میں گم
قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی تھی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری جب اپنا طبی مشن ترکی سے ہندوستان واپس لائے تو شبلی کی استقبالیہ نظم کے ایک ایک مصرعے جذبات میں سموئے تھے۔

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

فراق ملک و ترکِ خانماں و دوری منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کے پہنچے پئے یاری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمھیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری

تمھارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہرباری

تمھیں نے غازیوں کے زخموں پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامہ پر خوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر
زمیں پر پارہائے سینہ پر خوں بھی دیکھے ہیں

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

جنگِ بلقان کے دوران اڈریا نوپل جو کبھی ترکوں کا پایہ تخت تھا ہاتھ سے نکل گیا لیکن پھر ترکوں کے قبضے میں آگیا۔

اب خوشی کا اظہار شبلی اس طرح کرتے ہیں [۱۲]

پشت و پناہ ملت ختم الامم ہے تو — تو آج زور بازوئے شاہ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحہ وجود — مغرب ترا ہی عرصہ گہ ترک تاز ہے

تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں اب بھی مٹائے ہستی دشمن کا راز ہے

شبلی کی نظموں نے خلافت تحریک کے پس منظر میں وہ کام انجام دیا جو روسو اور والٹیر کی تحریروں نے انقلاب فرانس میں کیا تھا۔ انقلاب فرانس انقلاب جہاں کا سنگ میل ہے اس انقلاب نے قومیت اور جمہوریت کے علم اٹھائے، پس ماندہ کسان طبقے کے استحصال اور بحران کے خلاف قدم بڑھائے۔ یہ سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ معاشی اور سماجی زیادہ تھا جس کا نعرہ مساوات، بار آوری اور بقا کا تھا لیکن ان حقائق کا آغاز یعنی جذبۂ حریت عدل اور مساوات اور جمہوریت وغیرہ یورپ کے اندر انیسویں صدی میں مگر یہ سب کچھ انقلاب فرانس کی ناکامی کے بعد ہو گیا انقلاب کے بعد فرانس یاسیت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح تحریک خلافت کے بعد ہندوستان میں کم و بیش یہی کیفیت پائی گئی مگر فوراً بعد ہندوستان کے اندر سیاسی، سماجی اور معاشی نکھر پیدا ہوئی۔ یہ بھی سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں اتنا بڑا انقلاب کیوں اس وقت فرانس میں شروع ہوا؟ اس کی وجہ لوئی چہار دہم کا ملوکانہ اور جاگیردارانہ نظام تھا جس کے اندر طبقاتی منافرت، سیاسی، معاشی اور سماجی بحران اور بدحالی پائی جاتی تھی کیا یہ کیفیت برطانوی سامراج کے اندر اس وقت ہندوستان میں نہیں پائی جاتی تھی جو تحریک خلافت کا پیش خیمہ ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد فطرت کے لحاظ سے انقلابی تھے۔ روایتی مذہب کے خلاف تھے باپ پیر تھے مگر آپ اس بات پر دلگیر تھے کہ مریدان کے ہاتھ چومتے تھے اور پیر دباتے تھے اسی لیے بھائی کے حق میں جانشینی سے دست بردار ہو گئے گھریلو ماحول سے اس قدر بدظن تھے کہ کہا کرتے تھے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے[۱۴] سرسید کی زبان اور ان کی روشن خیالی کے قائل تھے۔ سرسید کی تحریریں پڑھنے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ یہاں تک کہ ان کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ "سرسید کی تصنیفات سے شوق نہیں عشق ہو گیا اور طبیعت کو اس تصور سے بھی صدمہ ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے اور میرے پاس نہیں ہے"۔

بنگال کا انقلابی ماحول مولانا آزاد کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ انقلابی فطرت اور شاعرانہ ذوق نے آزاد تخلص پسند کیا۔ ان کی سیاسی نشو و نما یہیں سے شروع ہوئی پھر انڈین

نیشنل کانگریس کی تحریک اور مہاتما گاندھی سے قریب تر ہو گئے۔ شبلی سے وہ بہت متاثر تھے شبلی نے بڑی حد تک ان کی رہنمائی اور پیشوائی کی شبلی کے انتقال پر وہ اس بات کا افسوس کرتے تھے کہ جہاں بہت سی خوبیاں ان کے ساتھ گئیں وہاں وہ ان کی پُر لطف صحبت سے محروم ہو گئے، الندوہ کی ایڈیٹری شبلی کی دین تھی خلافت اور ترکی کا تاثر آزاد نے شبلی کی نظموں سے خاص طور سے لیا۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے متعلق شبلی کی جاں سوز نظمیں مولانا کو اس قدر مسحور کر گئیں کہ اپنا معرکۃ الآراء اخبار "الہلال" اسی سال نکالا، جو خلافت، ترک، ترکی کی ہمنوائی اور برطانوی سامراج کی مخالفت میں پیش پیش رہا جس کی وجہ سے عوام میں بیداری پیدا ہو گئی۔

گاندھی جی سے مولانا آزاد کی ملاقات جنوری ۱۹۲۰ء کو دلی میں ہوئی۔ اس وقت مشورہ ہو رہا تھا کہ ایک وفد وائسرائے کے پاس بھیجا جائے جو خلافت اور ترکی کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے گا۔ گاندھی جی اس مشورے میں شامل تھے۔ اور انھوں نے مکمل طور سے اس تجویز کی تائید کی اور اس بات کا اعلان کیا کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں[۱۴]۔ خلافت تحریک کا مسئلہ روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اسی سلسلے کا ایک جلسہ ہوا، جس کے اندر گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور مولوی عبدالباری فرنگی محلی بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے ترک موالات کا پروگرام پیش کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ اب وفود اور عرضداشت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ ہمیں حکومت کی نوازشوں اور مہربانیوں سے باز آنا چاہیئے۔ اس طرح ہم حکومت کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ تو گاندھی جی کی ہمنوائی کے لیے مہلت چاہتے تھے لیکن مولانا آزاد نے بروقت گاندھی جی کے مشورے کی تائید کی ان کا خیال تھا کہ اگر لوگ ترکی کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو گاندھی جی نے جو کچھ سوچا ہے اس سے بہتر کوئی مشورہ نہیں ہو سکتا ہے[۱۵]۔ کچھ دنوں کے بعد میرٹھ کے اندر خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا جسمیں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ عوام کے سامنے ترک موالات کی اسکیم پیش کی اور مولانا آزاد نے فوراً تائید کی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ کے اندر کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ تاکہ گاندھی جی کے مشورے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچا جائے۔ گاندھی جی نے خیال پیش کیا کہ اگر ہم سوراج لینا چاہتے ہیں اور خلافت کا مسئلہ

مطمئن طریقے سے حل کرنا چاہتے ہیں تو ترک موالات ضروری چیز ہوگی لالہ لاجپت رائے نے اتفاق نہیں کیا۔ بی پن چندر پال نے پرزور تائید کی جبکہ وہ گاندھی جی کے دوسرے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے تھے مخالفت کے باوجود کافی اکثریت کے ساتھ ترک موالات کی تحریک پاس ہوگئی۔[۱۶]

خلافت کانفرنس کے اندر مکمل طور سے ترک موالات کی تحریک کو اپنا لیا گیا۔ عوام سے تعاون کے لیے گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے ملک کے گوشے گوشے میں دورہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب ناگپور کے اندر کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو اب سی۔ آر۔ داس اور لالہ لاجپت رائے نے بھی ترک موالات تحریک کی ہمنوائی کی لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ محمد علی جناح کانگریس سے الگ ہوگئے۔[۱۷] علی گڑھ کے طلباء سے مولانا نے خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا کہ حکومت سے ترک موالات اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے مولانا آزاد نے مسلمانان ہند کے لیے ہجرت کا فتویٰ دیا مولانا کا عقیدہ تھا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی چارہ شرعی نہیں[۱۸] مہاجرین کی تباہی اور بربادی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہجرت کی تحریک اس وقت کی سب سے بڑی سیاسی بھول تھی۔

جنوبی افریقہ میں کم وبیش گاندھی جی مسلمانوں کے لیڈر رہے۔ ہندوستانیوں میں وہاں مسلمان تاجر کافی تعداد میں موجود تھے ۱۹۱۵ء میں جب وہاں سے واپس آئے تو یہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ یہاں ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کام کریں گے یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں ہر دلعزیز ہوئے علی برادران کے ذریعہ گاندھی جی کو مسلمانوں سے دوستی کرنے کا موقع ملا[۲۰] مسلمانوں نے جب ہندوستان کو ایک نئے انقلاب سے ہمکنار کیا تو یہاں کے عوام نے اپنی رہی سہی چیزوں کو بھی بھلا دیا گاندھی جی کے لیے یہ مشکل کام تھا کہ یہاں کے لوگوں کو پھر سے نیا سبق شروع کرائیں بلکہ ان کے لیے آسان تھا کہ جو لوگ ابھی اس سبق کو بھولے نہیں ہیں۔ ان کو دہرایا جائے گاندھی جی علی برادران اور مولانا آزاد سب لوگ عوام کو مذہب کے ذریعے سیاست میں لانا چاہتے تھے۔ اس لیے مہاتما گاندھی اور مولانا جیسے الفاظ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے گاندھی اور مولانا محمد علی دونوں ہستیاں ایک دوسرے میں ضم ہوگئیں یہاں تک کہ مولانا گاندھی اور مہاتما محمد علی

آسانی سے کہا جاسکتا تھا۔ دونوں کے لیے مختلف جلسوں میں تکبیر اور ترنگے کے نعرے کے
نعرے لگتے۔ ہندوؤں میں ایک طرح سے بدظنی بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ مثلاً دونوں بھائیوں نے
گاندھی جی کو بڑی طرح اپنا لیا ہے جو چاہیں ان سے کام لے سکتے ہیں محمد علی پر گاندھی پرستی کا
الزام مسلمانوں کی جانب سے ہونے لگا۔ اسی شباب کے زمانے میں گاندھی جی نے خلافت کے
پلیٹ فارم سے ترک موالات کی تحریک کو منظور کرایا جس کو باور کرانے میں کانگریسی حضرات بھی ہچکچا
رہے تھے۔ یہ گاندھی جی کی بڑی کامیابی تھی جو خلافت تحریک کی دین تھی۔ ترکی میں بھی خلافت
ختم ہوئی تو ہندوستان میں خلافت تحریک بے جان پڑ گئی۔ لیکن مسلمانوں کی دوسری جماعتوں
میں جان آگئی۔ جیسے مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، ہندو وغیرہ۔ گاندھی جی ہندو مسلم دوسری دھاراؤں
کو روک کر صرف ایک منجدھار بنانے میں لگے رہے۔ یعنی کانگریس جس کا مقصد صرف
حصول آزادی تھی سو وہ پورا ہوگیا۔ اب کانگریس کی کیا حیثیت ہے اس کی ذمہ داری گاندھی
جی پر نہیں ہے بلکہ کانگریس خود ذمہ دار ہے انگلستان اور یورپ کی نئی تہذیب سے گاندھی
مرعوب نہیں ہوئے لیکن وہاں آزادی کے پھول کی خوشبو سے اس قدر مست اور سرشار
ہوئے کہ یہاں آکر آزادی کا پودا خود اپنے چمن میں لگایا۔ اس کے پھول اور خوشبو سے فیض یاب
ہوئے مبارک ہے ایسا مالی جس کو ایسی چمن بندی نصیب ہو۔

مولانا محمد علی بھی لندن کی ہوا کھاکر اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہیں بھولے لیکن دونوں کا
دائرہ عمل اور پس منظر مختلف تھا۔ مولانا محمد علی کا تعلق رام پور کی سیاست میں ایک متوسط
درجہ کے خاندان سے تھا۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ ہمیشہ مذہبی اور جذباتی رہا یوں بھی ریاستوں
کا ماحول انگریز کی بقیہ عملداری سے بالکل مختلف تھا۔ مولانا محمد علی یہاں سے آگے بڑھے
تو ان کو پیچھے مڑکر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ گاندھی جی جب ہندوستانی سیاست پر عمل پیرا
ہوئے تو ۱۹۱۷ء میں بہار کے اندر زرعی اجارہ داری کے مقابلے میں کسانوں کا ساتھ دیا
اور ان کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ عوام نے پہلی مرتبہ ان کو مہاتما گاندھی کا خطاب
دیا۔ مولانا محمد علی کو مولانا کا خطاب ان کی ذات سے بالاتر ہستی پیر و مرشد مولانا عبدالباری
کی جانب سے عطا کیا گیا۔ مولانا محمد علی عالمی یا بیرونی سیاست کی طرف متوجہ ہونے کے لیے

مجبور تھے کیونکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں مسلم قوم کی شمعیں جل رہی تھیں گاندھی جی کے سامنے ایک ملک اور ایک قوم کا مسئلہ تھا۔ اس قوم کے اندر مختلف مذہب وملت کے لوگ شامل تھے ایک عظیم مقصد بھی تھا۔ یعنی حصول آزادی، ایک ہی راہ میں ان کی صدا آسانی سے گونجتی رہی اور سب کو سنائی پڑتی رہی۔ مولانا محمد علی گنبد کے اوپر ایک طائر ہوتی کی طرح صدا دیتے رہے جو دور تک سنائی دینے کے بجائے ہوا کی لہروں میں گم ہوتی گئی۔ مولانا محمد علی اپنے شکستہ ساز کی آواز تھے۔ بلکہ مولانا کی آواز سے ساز خود شکستہ ہوگیا۔ مولانا محمد علی کی آواز اور شکستہ ساز کی آواز میں فرق محسوس کرنا عقل و دانش سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے مولانا محمد علی نے اپنی ذات کے لیے کیا کھویا کیا پایا۔ ایک دفتر کھلا ہوا ہے مولانا محمد علی یا دوسرے مسلمان جذباتی کیوں تھے اس کی خاص وجہ تھی کہ ان کا صدیوں کا سیاسی تہذیبی اور روایتی سرمایہ مٹ چکا تھا اور پہلی جنگ آزادی کے بعد ظلم وستم کی برکتیں صرف ان کے یہاں زیادہ ہوئیں جبکہ ان کے ساتھ ہمنوا اور بھی تھے۔ اس کے بعد بھی جنگ عظیم کی نوازشوں کے حقدار زیادہ تر وہی ٹھہرائے گئے۔

شاہ ولی اللہ نے علماء کو مسجدوں کے حجروں سے نکال کر سیاست کے میدان میں لاکر کھڑا کر دیا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ ان کے علاوہ مسلمانوں میں کوئی موجود نہ تھا۔ جو اس ذمہ داری کو سنبھال سکتا تھا۔ تحریک خلافت کے وقت بدلتے ہوئے حالات کے تحت سرسید کی کوششوں سے ایک نیا طبقہ وجود میں آچکا تھا جو جدید علوم اور نئی تہذیب سے بہت کچھ واقف تھا وہی نئے مسائل کو سوچ سکتا تھا اور دوسرے جدید تقاضوں کو پورا کر سکتا تھا۔ مگر اس مرتبہ خلافت تحریک کے موقع پر علماء خود بخود سیاست کے میدان میں نکل پڑے اس کی وجہ یہ تھی کہ علماء کے نزدیک انگریز دشمنی ایک مذہبی فریضہ بن چکا تھا دوسرے اگر وہ پیچھے رہ جاتے تو ان کو کون پوچھتا جبکہ پورے عہد وسطیٰ میں علماء طبقے کو اعلیٰ مقام حاصل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت ختم ہو جانے کے بعد بھی خلافت تحریک کے امکانات کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتے رہے علماء کو خلافت تحریک سے زیادہ اپنی تضحیک کی زیادہ فکر تھی۔

علی برادران نے بیسویں صدی کے پہلے چوتھائی حصے میں سیاست میں کارہائے نمایاں انجام دیئے خاص طور سے جنگ طرابلس، جنگ بلقان، کانپور مسجد، جنگ عظیم اوّل، صلح ورسا، خلافت تحریک، ترک موالات، سیوراجی سیاست تمام پارٹیوں کی کانفرنسیں گول میز کانفرنس وغیرہ ان تمام سیاسی ہماہمی میں خلافت تحریک کا رتبہ سب سے بالا رہا۔ سیاست سے دلچسپی کا اسلامی حکومتوں کو برطانوی حکومت کی فرمانروائی اور اثر سے بچانے اور مقامات مقدسہ کی حفاظت تھی دونوں بھائی اور گاندھی جی نے ہندوستان کے بنیادی مسائل اور بیرونی مسائل کو ایک ساتھ حل کرنے کی کوشش کی اور ہندوستانی سیاست کے آسمان پر یہ قوس قزح ایک خاص وقفے میں نظر بھی آئی۔ ان کے ہم خیال ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور وفاداران برطانیہ آغا خان، امیر علی، اور عباس علی بیگ بھی تھے کیونکہ ان لوگوں کے سامنے مقامات مقدسہ کا تحفظ ضروری تھا۔ آغا خان نے پیرس سے ایک مضمون خلافت سے متاثر ہوکر لکھا جس میں اس بات کا بھی احساس نمایاں تھا کہ کم از کم ترکی حکومت کو اناطولیہ در ایشیاء کو حکومت میں تسلیم کرلینا چاہیئے ان کو اپنی راجدھانی قسطنطنیہ واپس ملنی چاہیئے مسلمانوں کا خلیفہ ہر طرح سے آزاد ہونا چاہیے۔ مسئلے کا یہی صحیح حل ہے۔ مشرقی خطرات اس وقت نہیں زائل ہوں گے جب تک کہ ترکی کا مسئلہ نہیں ہوگا، میں اس کا اظہار کرچکا ہوں اور دوبارہ کررہا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اضطراب اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ انصاف نہ ہوگا۔[۲۲]

مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی علی گڑھ کے پروردہ تھے۔ علی گڑھ تحریک اُن کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ یہ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کو جہاں جہالت، کاہلی اور فرسودہ زندگی سے نکال کر لائی تھی۔ وہاں مولانا محمد علی ان کو یہ نیا سبق پڑھانا چاہتے تھے کہ بیرونی اثرات سے بچتے ہوئے بامقصد زندگی گذاری جائے۔ ان کی ہمنوائی میں علماء اور مغربی تعلیم یافتہ دونوں ہم خیال ہوگئے۔ ہندو مسلم نے خلافت تحریک میں شامل ہوکر برطانوی حکومت کے درپے آزار ہوگئے چراغ سے چراغ جلا۔ سوراجیہ تحریک بھی شروع ہوئی جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ عوامی راج ہونا چاہیے اس لیے اس کی حصول یابی

عوامی قربانیوں کے ذریعے ہونا چاہیے لیکن قربانیاں کم سے کم پیش کی جائیں اور یہ تعمیری کام عدم تشدد اور ترک موالات کے ذریعے انجام پائے مولانا محمد علی حکم خداوندی کے پابند اور اس کے سامنے سرنگوں تھے لیکن کسی بادشاہ وقت کی پابندی ان کے لیے روا نہ تھی۔ جہاں تک ہندوستان اور اس کی آزادی اور بہبودی کا تعلق تھا۔ وہ اول سے آخر تک ہندوستانی تھے ملکی معاملات، روز مرہ کی زندگی کے مسائل، موسم، آب وہوا۔ پیداوار اور ملک کی بہت سی چیزوں میں ان کے یہاں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ عدم تشدد کے وہ قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی بنیادی تعلیم امن ہے نہ کہ جنگ اور نفرت اس لیے وہ گاندھی جی سے قریب تر ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء کی آمد آمد ہے مولانا محمد علی کانگریس کے صدر ہیں عوام کے محبوب نظر ہیں۔ لیکن اب خلافت اور ترک موالات کی ہوا بدلنے لگی تھی۔ شدھی اور سنگھٹن کی وبا پھیل رہی تھی دوسری طرف مسلمانوں میں ردِ عمل کے طور پر تبلیغ اور تنظیم کی انجمنیں قائم ہو رہی تھیں ملک میں ناخوشگوار واقعات پیش آرہے تھے۔ لکھنؤ جلسے میں ایک ایک ہینڈ بل تقسیم ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ یہ وہی محمد علی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں اپنی تقریر کے دوران یہ کہا تھا کہ ایک فاسق و فاجر مسلمان گاندھی جی کے مقابلے میں بہتر ہے۔ جلسے میں ہندو مسلم دونوں شامل تھے۔ یہ اشتعال انگیزی بڑی خطرناک تھی مولانا محمد علی کی عین تقریر کے دوران بھی یہی سوال اٹھایا گیا تو انھوں نے اپنے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے یہاں بھی صاف گوئی سے کام لیا کہ گاندھی جی حصول آزادی کے بہتر کارواں ہیں خدمت وطن میں وہ صرف ان سے نہیں بلکہ اپنی ماں اور اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری سے بھی بڑھ کر قابل احترام ہیں لیکن جہاں تک عقیدے کا سوال ہے میں عقیدہ اسلام کو بہتر سمجھتا ہوں ص۲۳ گاندھی جی بھی مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کے سلسلے میں کافی محتاط تھے خلافت کے خاتمے کے بعد لوگوں نے اس کے بارے میں ان سے سوالات کیے تو گاندھی جی اس بات کے قائل تھے کہ خلافت تحریک نے قوم کو بیدار کیا یہاں بھی بڑا مناسب جواب دیا کہ میں کون ہوتا ہوں اس کے بارے میں رائے دینے والا۔ میری رائے ایک طرح سے غیر مناسب بات ہوگی۔ میری حیثیت ایک باہری فرد کی ہے میں کیسے اپنی رائے مسلمان بھائیوں

پر بھوپ سکتا ہوں اس مسئلے کو مسلمانوں کو خود حل کرلینا چاہیے سارے غیر مسلم یقین کے ساتھ ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی دشواریوں کے سلسلے میں مختلف قسم کے رہنماؤں کا جلسہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں تین سو حضرات نے شرکت کی خلافت کے سلسلے میں مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے حسرت موہانی نے کہا کہ ان کے مقامات مقدسہ تقریباً عیسائیوں کے قبضے میں آچکے ہیں یہ ان کی آزادی کے سلسلے میں مدد کے طلب گار ہیں۔ کچھ مسلمانوں رہنماؤں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ کسی بیرونی مسلم طاقت خاص طور سے افغانستان کے حملے کا خیر مقدم کریں گے تاکہ وہ ان کو آزاد کرادیں اور اسلام کے دشمنوں کو مار بھگائیں۔ اس خیال کو سُن کر پنڈت مالویہ، شوکت علی، مولانا آزاد سبحانی بیقرار ہوگئے مولانا ظفر علی خان نے اس خیال کی بہ زور تائید کی۔ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کسی بیرونی ملک کا غلام ہو جائے بلکہ برطانیہ کو سزا دینا چاہتے تھے لیکن سب ہندو اس خیال سے متفق نہ تھے، ہندو اکثریت کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ اسلام کے ساتھ ناانصافی کا جہاں تک تعلق ہے ہندو مسلم متحد رہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندو مسلمان کے ہر مسئلے میں اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان پر افغانستان یا کسی بیرونی طاقت کے حملے کو گوارا نہیں کرسکتے ہیں یہ مسئلہ بحث طلب ہوگیا کہ اول وفاداری ہندوستان کی ہونی چاہیے یا اسلام سے، مسلم رہنماؤں نے ہندو مسلم کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کا بیک وقت دو چیزوں سے تعلق ہے جو ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں وہ ہندوستان اور دنیائے اسلام، آزادی مسلمانوں کے نزدیک اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ دنیائے اسلام، -

خلافت کے رہنماؤں نے خاص طور سے ایم جی قدوائی نے واضح کیا کہ بیرون ہند کے مسلمانوں سے تعلقات کے معاملے میں جیسے کہ افغانستان یا ترکی ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو پہلے مسلمان تصور کرتے ہیں۔ بعد میں ہندوستانی،

لیکن جہاں تک ہندوستان کے اندرونی مسئلے کا تعلق ہے تو وہ ہندوستان پہلے پہلے اور مسلم بعد میں لیکن یہ اصول ہندو رہنماؤں کو متاثر نہ کرسکا اور ترک موالات کے مسئلے پر گفتگو جاری رہی۲۵ یہی بحث مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر اقبال کے درمیان بھی چھڑی تھی۔

گاندھی جی نے خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے درمیان بیرونی مسائل سے دلچسپی لیا اندرونی مسائل کا حل اور ہندو مسلم اتحاد تھا۔ مولانا محمد علی دونوں مسائل کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں تھے ان عظیم مقاصد کے لیے وقتی طور پر خلافت تحریک سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اسی لیے تحریک خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں ایک سکے کے دو رُخ ہوگیے۔ دونوں کے اجلاس ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ سرکاری اہلکار اور پریس اس کے خلاف کام کرتے تھے۔ گاندھی جی نے پان اسلام ازم کو کافی وسعت کی نظر سے دیکھا۔ ایک وقت میں بہت سے ہندو خاص طور سے پنڈت مدن مالوی اور رابندر ناتھ ٹیگور اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ خلافت کا مسئلہ کانگریس پروگرام میں شریک کیا جائے۔ یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ تھا۔ لیکن گاندھی جی کا سینہ تو حریت کے اجالوں سے آباد تھا۔ ان کی امید یقین محکم بن چکی تھی۔ ان کا ذہن تشدد، تعصب سے پاک تھا ہندوؤں کی دانشوری کا عکس ان پر کبھی نہیں پڑا، ان کی سیاسی بصیرت پر عقل کی گرہیں نہ لگ سکیں۔ ان کے عزائم کی راہیں سیاسی، سماجی اور مذہبی دشواریوں کے درمیان سے ہوکر گزریں۔ ان کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کی کامرانی کے لیے خلافت تحریک ایک بہت بڑا سہارا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ترک موالات، ستیہ گرہ جیسے عملی قدم اٹھانے میں کامیابی حاصل کی۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے کو تعلیمی سرگرمیوں تک محدود رکھا تھا۔ دھیرے دھیرے مدرسوں کی فضا قومی تحریک کی خوشبو سے معطر ہونے لگی۔ خلافت تحریک شروع ہوئی اس کے اندر اتنا اتار چڑھاؤ آتا رہا کہ اسی

کی بدولت مسلمان اپنے مسائل زور وشور کے ساتھ پیش کرتے رہے ہندوستانی سیاست میں ان کو اہمیت دی جانے لگی۔

خلافت تحریک مشرق و مغرب کے خمیر کا ایک مرکب تھا جو مذہب اور سیاست کی ملی جلی جڑواں حقیقت تھی جس کے اندر صرف ترکی کے وقار کا سوال نہ تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اس کو دل سے اپنایا تھا کہ ہندوستان کے اندر ان کی انفرادیت اور اسلامی کلچر باقی رہے۔ اگر ترکی پر زوال آیا تو کہیں مسلمانوں کی حیثیت یہودیوں کی طرح نہ ہو جائے اور دنیا میں سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے تو اس وقت کیا ہوگا دوسری طرف یورپ کی طاقتیں یہودیوں کو فلسطین ان کو جائے مقام کے طور پر عطا کرنا چاہتی تھیں ان کے خوف نے بھی مسلمانوں کو خلافت تحریک سے قریب تر کر دیا خلافت تحریک کی تلخیوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ہتھیار عطا کیا یعنی یکجہتی جو حکومت کے خلاف استعمال ہوا۔ سیاسی شعور پیدا ہوا شروع شروع میں نہ یہ زیادہ مخلص تھے نہ اہل۔ بعد میں مستقبل کی سیاسی راہوں پر نکل پڑے بیرونی مسلم کا سیاسی شخصیتوں سے تعارف ہوا اور ایک دوسرے سے واقف ہوئے اندرونی طور پر قومی تحریک سے آشنا ہوئے گاندھی جی کو لیڈر تسلیم کیا اور گاندھی جی نے مسلم رہنماؤں کی صحیح تشخیص کرنے کے بعد ان کی ہمدردی سچائی، صلاحیت، دانشوری بہادری، دلیری، جوانمردی کو بڑے سلیقے کے ساتھ کے ساتھ کانگریس تحریک کے ساتھ لگا دیا

خلافت تحریک خلافت کے تحفظ کے مقصد سے چلائی گئی تھی وہ خلافت کو نہ بچا سکی۔ مگر دوسرے مسائل سے دوچار ہوئی مختلف لوگوں نے اس کو مختلف طریقوں سے سمجھا اور استعمال کیا: بچوں کے نزدیک اس کے جلسے جلوس اور میلوں ٹھیلوں کی حیثیت رکھتے تھے عوام اس کے نعروں سے جذباتی غذا حاصل کرتے تھے جیسے کہ گاندھی جی کی جے۔ مولانا محمد علی زندہ باد، "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" وغیرہ مذہبی لوگوں کے لیے ایک مذہبی فریضہ تھا سیاست دانوں کے لیے ہوش ربا سیاست تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک نعمت تھی، تمام مختلف الخیال، روایتی اور جدید روش پر چلنے والے مسلمان سب ایک پلیٹ فارم پر نظر آنے لگے۔ سیاسی جست لگائی

گئی مختلف سمتیں نمودار ہوئیں جن پر نئی نسل گامزن ہوئی محرومی اور کامیابی کے دائرے بنتے اور بگڑتے رہے۔ فکر کی شمعیں روشن ہوئیں، غنودگی ختم ہوئی یاس دھواں بن کر اڑنے لگی، جس بیٹے نے خلافت پر جان دے دی۔ اس کی جد وجہد اور قربانی بھی رائیگاں نہیں گئی کوئی تحریک قوم کو نیا موڑ عطا کرتی ہے ساتھ ہی ساتھ نظام کہن سے بیزار کرتی ہے جدید سمتوں کے تعین کی نشاندہی کرتی ہے پیش روی میں مخالفت مزاحمت اور دشواریوں پر قابو پانا کامیابی اور دوسری حالت میں ناکامی اٹھاتی ہے اس کا انحصار قومی افراد کی سوجھ بوجھ، کسل، بساط، ہمت، جرات، صلاحیت، احساس اور ادراک کی قوتوں پر ہوتا ہے۔ یہی کاوش تاریخ میں ایک دھارے کا پتہ دیتی ہے مولانا محمد علی اپنے عزم بالجزم اور اٹل ارادوں کے لحاظ سے عظیم القدر اور عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے کوئی حکومت کسی تحریک اور اصلاح کو آسانی سے قبول نہیں کرتی ہے لیکن مولانا محمد علی کی آتش نوائی، اضطراب، جرات اور ہمت سے تشکیل نو کی قسم کھائی تو مستحکم اور وسیع سامراجی حکومت کی سطوت پر شکن پڑ گئی اور یہ جنگ عظیم اول کے بعد اور جنگ عظیم دوم کے آتے آتے انحطاط اور زوال کی جھریاں ثابت ہوئیں صرف دو دہے کے بعد ایک عظیم الشان حکومت کا خیمہ اکھڑنے لگا ہندوستان کے افق پر آزادی کا نیا سورج نمودار ہوا۔ جس کی روشنی میں دوشیزہ آزادی کی نورانی آنکھوں میں تحریک خلافت کی سرخیاں صاف صاف نظر آئیں۔ خلافت مولانا محمد علی کی جان وایمان بن گئی۔ تمام عمر اس سے انحراف نہیں کیا ترکی میں جب ڈوبی توقین ہوا کہ حجاز میں نکلی، سلطان عبدالعزیز نے جب شریعت کا احیاء اور احکام الٰہی کے نفاذ کا اعلان کیا تو مولانا محمد علی کی آنکھوں میں چمک آگئی سلطان کی حمایت پر پیر مرشد مولانا عبدالباری کی مخالفت کو بھی گوارا کیا۔ گاندھی جی نے بھارت کو غلام دیکھا تو سیاسی طور انگریز ایک پل نہ بھائے دو مخالف ایک ہوگئے۔ دونوں خلافت تحریک کی کشتی میں بیٹھ کر غلامی کی ندی کو پار کرتے ہوئے ساحل آزادی سے قریب تر ہوتے گئے۔ کشتی کے ایک سرے کا پتوار مولانا محمد علی کے ہاتھ میں تھا دوسرے سرے پر گاندھی جی

فن ملاحی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی کا یہ عالم تھا جیسے بحر سیاست سے ایک موج بیقرار اٹھی ہو فطرت نے جس کا نام مولانا محمد علی رکھ دیا تھا نشیمن پھک چکا تھا لیکن خاک نشیمن پر سجدے کیے جا رہے تھے۔

حواشی

۱ؔ Niyazi Berkes, the Development of Secularism in Turkey Magill University Press 1964 P 44.

۲ؔ محمد عزیز، دولت عثمانیہ، جلد اول، طبع دوم، اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء ص ۱۸۱۔۔44 P 1964

۳ؔ محمد عزیز، دولت عثمانیہ، جلد اول طبع دوم۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء ص ۱۸۱۔۔44 P 1964ء

۴ؔ Chaudhary Khaliquzzaman, Pathway to Pakistan, Lahore 1961 P. 47-49

۵ؔ ایضاً صفحہ ۲۴ ۶ؔ خلافت تحریک ص ۱۰۲ ۷ؔ ڈاکٹر محمد اشرف، ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر دہلی ۱۹۶۳ء ص ۳۰۔۳۱ ۸ؔ محمد رضا انصاری، بانی درس نظامی علی گڑھ ۱۹۷۳ء ص ۱۴۔

۹ؔ عبدالماجد دریابادی، محمد علی حصہ اول اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۲۲۱۔۲۲۲۔ اور قاضی محمد عبدالغفار حیات اجمل علی گڑھ ۱۹۵۰ء ص ۱۲۹۔

۱۰ؔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات، جلد دوم، دیوبند ۱۹۵۴ء ص ۲۵۵

۱۱ؔ سید سلیمان ندوی حیات شبلی۔ اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء ص ۵۹۹ ۱۲ؔ آزادی کی کہانی خود آزاد کی زبانی دہلی ۱۹۵۸ء ص ۳۹۷

۱۳ؔ Maulana Abul Kalam Azad, India Wins Freedom Delhi 1953 P 8

۱۴ؔ ایضاً ص ۹ ۱۵ؔ ایضاً ص ۱۰ ۱۶ؔ ایضاً ص ۱۰۔ ۱۷ؔ خلافت تحریک ص ۱۷۰۔

۱۸ؔ غلام رسول مہر، تبرکات آزاد، دہلی ۱۹۶۳ء ص ۱۶۴۔۱۶۶۔

۱۹ؔ Francis Robinson, Separatism Among Indian Muslims, Delhi, 1975, Ph 276-97

۲۰ؔ P.C. Bamford, History of the Non Co-operation and Khilafat Movement Delhi PP. 1-2 1974

۲۱ؔ P.C. Bamford, History of the Non Co-operation and Khilafat Movement

۲۲ؔ محمد علی حصہ اول۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۱۳۳۔۱۳۵۔

۲۳ؔ S.R. Bakhshi Gandhi and Khilafat Delhi, 1985, P 99,

۲۴ؔ Krishna Gopal, the Khilafat Movement in India. Journal of the Royal Asiatic Society Parts 1 and 2, 1968 P 51